Fikr-o-Nasar (Islamabad) vol. 2:1 (1964)

انتخاب

سلاطینِ ہند اور علما و صوفیہ کے تعلقات

مسلمانوں کی حکومت کے زمانہ میں ان کی سیاسی، مذہبی اور روحانی طاقتوں کی نشو و نما سلاطین علماء اور صوفیہ کے ذریعہ سے ضرور ہوئی، لیکن پھر ان تینوں گروہوں میں جتنی ہم آہنگی ہونی چاہیے تھی وہ نہ ہو سکی، ضرورت اس کی تھی کہ سلاطین، علماء کی مذہبی حمیت اور ایمانی حرارت سے پورا فائدہ اٹھاتے، اور سلاطین پر تنقید کے ساتھ ان کے سیاسی اقتدار کا بہتر سے بہتر مصرف لے کر مسلمانوں کی مذہبی غیرت کا صحیح اندمال کرتے رہتے، اسی طرح اکابر صوفیہ سے وہ تعاون کرتے، کیوں کہ مسلمانوں میں روحانی قوتیں ان ہی سے پیدا ہوتی رہیں۔ ان سے سلاطین اور علماء دونوں کو پورا فائدہ اٹھانا چاہیے تھا، اس ہم آہنگی سے عام مسلمانوں کا ایک صالح، پائدار اور جاندار معاشرہ لازمی طور پر تیار ہو جاتا، جس سے اچھے سلاطین، اچھے امراء، اچھے علماء اور اچھے صوفیہ بھی پیدا ہوتے رہتے، جو عام سیاست اور معاشرت کے نگہبان بن کر اس کو زوال سے بچائے رکھتے، یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مغلوں کے آخری دورِ حکومت میں عام مسلمانوں کی مذہبی، اخلاقی اور روحانی

زندگی بھی کھوکھلی ہوچکی تھی، ورنہ وہ خود سیاست کو سنبھال کر اس کو ایک غیر قوم کے استیلاء سے محفوظ رکھ سکتے تھے، اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اپنے پورے دور حکومت میں ایک ذہنی بحران میں مبتلا رہے۔ ان کا دماغ سلاطین کی طرف رہا، کیونکہ ان ہی کے ذریعہ ان کو دنیا ملتی تھی لیکن جن کے ذریعہ ان کو دین ملتا، وہ ان سلاطین کی حکومت کو فکری طور پر غیر اسلامی سمجھتے۔ اور پھر جن سے مسلمانوں کی روح کی جلا ہوتی، وہ یعنی صوفیہ ان دونوں سے الگ ہوتے چلے گئے۔ ان نظری اختلافات سے مسلمان ذہنی کش مکش میں مبتلا رہے، وہ کبھی اپنے جان و مال کے نگہبان، کبھی اپنے ایمان کے پاسبان اور کبھی اپنی روح کے محافظ کو تاکتے، اور زبان حال سے ان تینوں میں ہمنوائی اور باہمی تعاون کے خواہاں ہوتے، لیکن کوئی تحریک اور کوئی قوت ایسی پیدا نہیں ہوئی جو ان میں ٹھوس اور مستحکم بنیاد پر یگانگت پیدا کر دیتی اسی لئے مسلمان کبھی بادشاہ کے ساتھ ہو جاتے، کبھی علماء کے سایۂ عاطفت میں پناہ لیتے اور کبھی صوفیہ کا دامن تھامتے، اس ذہنی بحران کی وجہ سے ان میں اجتماعی مقصدیت اور مرکزیت نہ پیدا ہو سکی، وہ برسر اقتدار اسی وقت تک رہے جب تک ان کے حکمرانوں کی قوت برقرار رہی، اور جب یہ قوت کمزور ہو گئی تو انھوں نے خود محسوس کیا کہ ان کے قوائے عمل شل ہو کر رہ گئے، اور ان میں وہ کردار اور بلند اخلاق اور اعلیٰ فکر و عمل نہیں رہے جن کی مدد سے حکمران کے نا اہل ہونے کے باوجود حکومت کو برقرار رکھ سکیں۔

اور ایک بہت ہی شاندار حکومت ختم ہو کر رہ گئی، اکبر کے زمانے میں یہی حکومت اپنے زمانہ میں دنیا کی طاقتور ترین حکومت سمجھی جاتی تھی، اورنگ زیب کے ناقد جدو ناتھ سرکار کو بھی یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ اس کے عہد میں مغلوں کی سلطنت کا رقبہ سب سے زیادہ تھا۔ اور ہندوستان کی پوری تاریخ میں یہاں برطانوی حکومت سے پہلے کبھی اتنی بڑی سلطنت قائم نہ ہوئی تھی۔ غزنی سے چاٹگام اور کشمیر سے کرناٹک کا پورا علاقہ ایک ہی تاج و تخت کے ماتحت تھا، اور پھر دور دراز علاقوں میں لداخ اور مالابار میں بھی منبروں پر اسی بادشاہ کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔

لیکن یہ سلطنت مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتی رہی۔ اس کے زوال کا الزام اورنگ زیب کے بعد کے ناکارہ حکمرانوں پر آتا ہے کہ انھوں نے جانشینی کی خونریز لڑائیاں لڑ کر حکومت کو نقصان پہنچایا، نفاق پرور، مفاد پرست اور راحت پسند امراء کو دربار میں جمع کر کے اس کو سازشوں اور ریشہ دوانیوں

کا مرکز بنا دیا۔ طریقۂ جنگ میں جو ترقی ہوتی رہی اس سے وہ بالکل بے خبر رہے اور شمشیر و سنان کو چھوڑ کر طاؤس و رباب میں پڑ گئے وغیرہ،

لیکن اس زوال کی ذمہ داری علماء صلحاء اور صوفیہ پر بھی عائد ہوتی ہے، وہ اچھی معاشرت بناتے رہتے تو حکومت بھی اچھی رہتی، مگر علماء اچھی معاشرت بنانے کی جدّوجہد کے بجائے زیادہ تر جزوی اختلافات میں مبتلا رہے۔ حرام و حلال کے مسائل میں وہ ایسے الجھے کہ عام لوگوں کو دین میں صرف خشکی ہی خشکی نظر آتی، اور وہ اس کے دائرہ میں آسانیاں کم اور دشواریاں زیادہ پاکر اپنی زندگی کو تنگ محسوس کرنے پر مجبور ہو گئے۔ علماء نے مذہب اور شریعت کی گہرائیوں کو سمجھ کر غور و فکر سے کم کام لیا، انھوں نے معاملات اور اعمال حسنہ پر کم اور عقائد و عبادات پر زیادہ زور دیا، ان کی درسگاہوں میں تعلیمی نصاب بھی ضرورت زمانہ کا لحاظ کئے بغیر بالکل جامد رہا، اسی لئے وہ زیادہ تر حواشی اور تعلیقات ہی لکھنے میں مشغول رہے، اور صرف، نحو، معانی اور یونانیوں کے علوم میں کچھ ایسے ڈوبے کہ احیائے دین اور تجدید یقین کے لئے جس اجتہاد کی ضرورت تھی، اس کو اجتماعی طور سے عمل میں لانے کی کبھی کوشش نہیں کی، وہ سلاطین کی حکومت سے بدظن ہو کر خلافت راشدہ کے طرز حکومت کے خواہاں تو ضرور رہے، لیکن اس طرز حکومت کے لئے خلافت راشدہ کی معاشرت بھی پیدا کرنے کی ضرورت تھی، جو علماء و صلحاء کے ذریعہ ہی بن سکتی تھی لیکن وہ صرف محراب و منبر کی زینت اور درس و تدریس کی مسند پر متمکن رہنے ہی پر اکتفا کرتے رہے۔ اور ان کی نظر سلاطین کی طرف اٹھی رہی کہ وہ اچھی حکومت کے ساتھ اچھی معاشرت بھی بنائیں۔ لیکن سلاطین کے ذریعہ صالح معاشرت کا بننا ممکن نہ تھا، وہ معاشرت میں حسن عجم تو پیدا کر سکتے تھے، لیکن سوز دروں عرب، علماء اور صلحاء ہی کی وساطت سے پیدا ہو سکتا تھا۔ مسلمانوں میں خلافت راشدہ کے عہد کا اتباع سنت اور زہد و تقویٰ کے ساتھ اخلاق کی بلندی، کردار کی پاکیزگی، خلق اللہ کی خدمت گزاری، مخالفین کے ساتھ حسن سلوک، مصیبت کے وقت صبر، تحمل، معاملات میں دیانت و صفائی کا پیدا کرنا، علماء ہی کے بس کا تھا، منبر پر بیٹھ کر وہ ان باتوں کی تلقین تو کرتے رہتے لیکن ان کی دعوت میں عزیمت نہیں تھی، اسی لئے وہ مسلمانوں میں وہ سوز و مستی اور جذب و شوق پیدا نہ کر سکے، جن سے وہ صحیح معنوں میں مومن بن کر صاحب لولاک ہوتے، اور حکومت کو برائیوں سے بچا کر اس کے نگہبان و پاسبان بھی بنے رہتے۔

شروع میں صوفیائے کرام نے اچھی معاشرت ضرور بنائی۔ لیکن آخر میں وہ بھی غیر موثر ہو گئے تھے۔

تم باذنِ اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

(اقبال)

"ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر"

از جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب
بہ شکریہ رسالہ "معارف" اعظم گڑھ
بابت مئی ۱۹۶۴ء

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ٥

اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی ضروری ہے کہ وہ خیر کی طرف بلایا کرے اور نیک کاموں کے کرنے کو کہا کرے اور برے کاموں سے روکا کرے اور ایسے ہی لوگ کامیاب ہوں گے۔

(سورۂ آل عمران۔ آیت ۱۰۴)